اس بات کی اہمیت ہم پر اس وقت واضح ہوتی ہے جب ہم مسلمانوں میں تجدد پسند اور مغرب زدہ طبقے کو دیکھتے ہیں جو مغرب کی غالب تہذیب سے اتنے متاثر و مرعوب ہیں کہ وہ اسلام کو توڑ مروڑ کر مغرب ہی کے متعین کردہ معیارات پر لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ جامعہ ازہر نے بعض اسلامی امور پر ایسے امور کو جائز قرار دینے کے لیے فتوے بھی دیے ہیں۔ جامعہ ازہر کے شیخ طنطاوی نے فلسطینی مجاہدین کے اسرائیل پر خودکش حملوں کو ناجائز قرار دیا ہے جبکہ آزاد علما کی اکثریت نے اسے جہاد قرار دیا ہے۔

انیسویں صدی میں ہندستان پر برطانوی استعماری قبضے کے دوران میں انھیں خوش کرنے کے لیے مشرقی پنجاب سے مرزا غلام احمد قادیانی نے اپنی نبوت کا دعویٰ کیا اور پھر اس جھوٹے نبی نے جہاد کو منسوخ کرنے کا اعلان کیا، تاکہ انگریزوں کے خلاف سید احمد شہید (م: ۱۸۳۱ء) کی تحریک جہاد کو صحیح سمجھنے اور اس کے تسلسل میں جدوجہد کرنے والے اس کی تائید و حمایت سے پیچھے ہٹ جائیں۔

قیام پاکستان کے بعد ایسے ہی تجدد پسندوں کے رہنما چودھری غلام احمد پرویز (م: ۱۹۸۵ء) نے انکارِ حدیث کا فتنہ کھڑا کیا، اور حدیث کی تشریحات سے اپنے آپ کو آزاد کر کے قرآن کی من مانی تفسیر کر ڈالی۔ معجزات کا انکار کیا۔ لیکن خدا بھلا کرے سید مودودی کا جنھوں نے ایسے فتنوں کو دلیل سے بے نقاب کر کے انھیں بے اثر بنا دیا۔ البتہ انٹرنیٹ پر امریکہ کے کچھ منکرین حدیث اپنے نظریات کی اشاعت کی کوشش کرتے رہتے ہیں، لیکن انھیں اس کے منہ توڑ جوابات بھی نیٹ پر دینے والے موجود ہیں۔ جن میں سب سے زیادہ قابل ذکر اسکالر امریکہ کے پاکستانی نژاد ڈاکٹر کوکب صدیقی ہیں، جو فکر مودودی کے علم بردار بھی ہیں، اس کا دفاع بھی کرتے ہیں اور منکرین حدیث اور اسلام پر اعتراضات کرنے والوں کو فکر مودودی کی بنیاد پر دلائل کے ساتھ جوابات بھی دیتے ہیں۔

اسپوزیٹو کے مندرجہ بالا بیانات کے ایک نکتے سے مجھے اختلاف ہے۔

پروفیسر اسپوزیٹو کا کہنا ہے: حسن البناء اور مولانا مودودی معاشرے کے اجتماعی اور اخلاقی بگاڑ کی طرف متوجہ تھے، لیکن بعد میں یہ لوگ سیاست اور حزب اختلاف جیسی دلدل میں پھنس گئے۔

شاید ابھی تک اسپوزیٹو کی سمجھ میں یہ بات نہیں آسکی کہ اجتماعی اور اخلاقی بگاڑ کا منبع حکومت ہے۔ جس کی مثال مولانا مودودی نے ریل کے انجن کے ڈرائیور سے دی ہے کہ جس سمت میں بھی وہ

ریل گاڑی لے جائے گا' اس میں سفر کرنے والے اس سمت میں جانے کے کتنے ہی مخالف کیوں نہ ہوں' انھیں چار و ناچار اسی طرف جانا پڑے گا۔ اس لیے اس کا حل اس کے سوا کچھ اور نہیں ہوسکتا کہ انجن پر ایسے ڈرائیور کو لایا جائے جو اسے صحیح سمت پر لے جائے۔ ڈرائیور کو بدلے بغیر سمت بدلنے میں مسافروں کی ساری کوششیں ناکام رہیں گی۔ جب حکومت کو بدلے بغیر کوئی اخلاقی یا سماجی اصلاح ممکن نہیں ہے تو سیاست میں آنا ضروری ہو جاتا ہے۔ یہی فکر مودودی کا جوہری پیغام ہے کہ اس نے مسلمانوں کی توجہ انفرادی اعمال کے ساتھ ساتھ اجتماعی جدوجہد کی طرف مبذول کرائی' کہ روحانیت کا حصول اسی گندی سیاست کو پاک صاف کرنے کی جدوجہد میں مضمر ہے۔ اسی کنویں میں کود کر تیرا کی سیکھنی ہے۔ خشکی پر کتنی ہی تربیت حاصل کر لی جائے' وہ مولانا مودودی کی نظر میں بے معنٰی اور لاحاصل ہے' کیونکہ پانی میں پہلے غوطے ہی میں خشکی کی ساری تربیت بیکار ہو جاتی ہے۔

آگے چل کر مولانا مودودی کے حوالے سے اسپوزیٹو نے لکھا ہے: سید مودودی کی نظر میں جنوبی ایشیا میں مسلم اقتدار کا زوال پذیر ہونا اور دولت عثمانیہ کا ٹکڑے ٹکڑے ہو جانا برطانوی اور فرانسیسی سامراجیت کا نتیجہ ہے۔ اور یہ کہ مسلمانوں کی شناخت اور اتحاد کو ہندوؤں کی سیکولر قومیت سے بھی اور جدید تصورِ قومیت کے زبردستی نفاذ سے بھی خطرہ ہے۔ مولانا نے بتایا ہے کہ جدید تصورِ قومیت مغربی آئیڈیالوجی ہے جس کا مقصد مسلمانوں کو کمزور اور منقسم کرنا ہے۔ مسلمانوں میں مساوات اور سیسے کی طرح مضبوط دیوار بن کر رہنے کا اسلامی اخوت کا تصور جو ایک آفاقی تصور ہے۔ مغربی تصورِ قومیت مسلمانوں کو تعلیم و ترغیب دیتا ہے کہ وہ اس آفاقی تصور کو منہدم کر دیں اور اپنی شناخت کی بنیاد زبان' نسل اور قبیلوں پر رکھیں۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس مستشرق نے اسلام کے تصورِ اخوت اور فکر مودودی میں اس کی جھلک کا صحیح ادراک کیا ہے۔ وہ مولانا مودودی اور حسن البناء کے افکار کی یکسانیت کی مزید تشریح کرتے ہوئے کہتا ہے: ان دونوں کو اسلام کی عظمت رفتہ سے والہانہ عقیدت تھی' وہ خاص طور پر اٹھارہویں صدی کی احیاے دین کی تحریکوں سے بھی دل چسپی رکھتے تھے لیکن اس بنا پر' وہ ان قدیم تحریکوں کے طریقوں کے اسیر ہو کر نہیں رہ گئے بلکہ بڑی بالغ نظری سے انھوں نے جدید دور کے تقاضوں کو پورا کرنے کی کوشش کی۔ وہ جس طرح مغرب زدہ سیکولر تعلیم یافتہ طبقے کے تصورات پر تنقید

کرتے تھے، اسی طرح ایسے مسلم معاشرے کے بھی مخالف تھے جس پر مذہبی قدامت پرستی حاوی ہو۔ اگرچہ وہ جدید اسلامی مصلحین کی کوششوں سے متاثر تھے جنھوں نے جدید دور اور قدیم روایت پرستی کے درمیانی خلا کو پر کرنے کی کوشش کی۔ لیکن ان کا خیال تھا کہ یہ تجدد پسندی، اسلام کو مغربیت اور مغربی اقدار کے تابع کرنے کے مترادف تھی۔ جدید دور کے چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لیے یہ لوگ اسلام میں من مانی ترمیم و تنسیخ کر کے اس کو مغربی معیارات پر پورا اترنے والے سانچے میں ڈھالنا چاہتے تھے۔ یہ دونوں مفکرین مغربیت کے خلاف تو ضرور تھے، لیکن عصر حاضر کے تقاضوں کی تکمیل کے لیے سائنس اور ٹکنالوجی کے استعمال اور اس کی تجدید کو وہ ضروری سمجھتے تھے۔ اس مقصد کے لیے ان دونوں کے خیال میں اسلام میں کسی ترمیم و تنسیخ کی ضرورت نہیں تھی۔ ان سب کاموں کے لیے اسلام ایک کامل و مکمل اور خود کفیل دین ہے۔ جدید دور کے سیاسی، معاشی اور تمدنی تقاضوں کی تکمیل کے لیے انھوں نے علما کے قرونِ وسطیٰ کے قدیم تصورات کا سہارا لینے کے بجاے اسلام کی بنیادی اور الہامی ہدایات کو ایک نئے رنگ اور نئی تعبیر کے ساتھ پیش کیا، کیونکہ اسلام کی یہ تعلیمات، جدید دور کے سارے مسائل حل کرنے کے لیے کافی وشافی ہیں۔

اسپوزیٹو نے یہ بتانا چاہا ہے: ان دونوں مفکرین نے کس طرح اسلامی تعلیمات کو محفوظ و مامون رکھ کر انھی کے ذریعے یورپی اور مغربی تہذیب کے افکار و نظریات اور طور طریقوں کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی، اور ان کے ہاں اسلام کی طرف مراجعت، دور ماضی کی طرف مراجعت کے ہم معنی نہیں ہے، بلکہ اسلام ہی کو وہ دور حاضر کی پیدا کردہ ان ساری بیماریوں کا علاج سمجھتے ہیں، جو مارکسزم اور مغربی نظام سرمایہ داری نے پیدا کی ہیں۔

اسپوزیٹو نے بتایا ہے: فکر مودودی نے مذہبی طبقے کی قدامت پرستی اور مغرب زدہ طبقے کی تجدد پسندی سے ہٹ کر مسلمانوں کو ایک تیسرا راستہ دکھایا۔ انھوں نے مسلمانوں کو یہ بتایا کہ اسلام اللہ کا دیا ہوا ایک ابدی نظام حیات ہے اور اس میں یہ صلاحیت ہے کہ یہ قیامت تک کے سارے زمانوں میں ہمیشہ قابل عمل رہے گا، بلکہ اسلام کے اصولوں پر چل کر عصر حاضر کی پیدا کردہ تمام مشکلات و مسائل کا مداوا بھی اللہ کے بتائے ہوئے الہامی نظام میں موجود ہے۔ انھوں نے الٰہیات اور سائنس و ٹکنالوجی کی تعلیم میں تطبیق کی راہ دکھائی اور اس میں کوئی معذرت خواہانہ رویہ اختیار نہ کیا۔

یہی وہ تیسری راہ ہے، جسے اسپوزیٹو کے مطابق مسلمانوں کا سوادِ اعظم آج غیر ارادی اور غیر شعوری طور پر قبول کر چکا ہے۔

آگے چل کر یہی مصنف کہتا ہے کہ: معمولی سے اختلافی نقطہ نظر کے باوجود حسن البناء اور مولانا مودودی دونوں ایک مشترک عالمی نظریاتی نقطہ نظر رکھتے ہیں۔ بعد ازاں اسلامی تحریکوں نے اسی نقطہ نظر کو اپنی بنیاد بنایا اور اسی نے ان تحریکوں میں جہاد کا جوش و جذبہ ابھارا۔ یہ دونوں جن باتوں پر متفق تھے، وہ یہ ہیں:

۱- اسلام ایک ایسا طریق زندگی ہے جو زندگی کے سارے شعبوں پر محیط ہے۔ اسلام واضح کرتا ہے کہ سیاست شجرِ ممنوعہ نہیں ہے۔

۲- قرآن جو اللہ کی طرف سے نازل کردہ ایک الہامی کتاب ہے اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور صحابہ کرامؓ کی زندگی وہ بنیادیں ہیں جو ایک مسلمان کی روزمرہ کی زندگی کے لیے نمونہ فراہم کرتی ہیں۔

۳- اسلامی قانون (شریعت) کا نفاذ ہی وہ اصل مقصود ہے جو ایک مسلم معاشرے کی تشکیل کا خاکہ فراہم کرتا ہے اور یہ کسی مغربی نمونے کا محتاج نہیں ہے۔

۴- اسلام سے دوری اختیار کر کے مغرب کا سہارا لینے کا عمل ہی وہ بنیادی سبب ہے جو امت مسلمہ کے زوال کا سبب بنا۔ اسلام کی صراط مستقیم کی طرف لوٹ آنا ہی وہ واحد ذریعہ ہے جس سے اس دنیا میں امت مسلمہ کی شناخت، قوت و طاقت، سطوت و جلال اور شوکت و عظمت بحال ہو سکتی ہے اور آخرت میں بھی اجرِ عظیم کا امکان پیدا ہو سکتا ہے۔

۵- سائنس اور ٹکنالوجی پر عبور حاصل کر کے اس کو اسلام اور مسلمانوں کی سربلندی کے لیے استعمال کرنا ضروری ہے۔ لیکن ضرورت یہ ہے کہ اس کام کو مغربیت اور لادینیت کی آلایشوں سے بچتے ہوئے انجام دیا جائے، اور اس کا استعمال اور اطلاق اسلامی اصولوں کی بنیاد پر ہونا چاہیے۔ ان سے ہٹ کر نہیں۔

۶- جہاد ہی وہ واحد راستہ ہے جس کے ذریعے سے مسلم معاشرے کو اور ساری دنیا کو اسلامی اصولوں کی بنیاد پر استوار کیا جا سکتا ہے۔ یہ جہاد انفرادی طور پر بھی ہونا چاہیے اور اجتماعی